باسمہٖ تعالیٰ

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا ......

یہ وُہ سحر تو نہیں!

یوم آزادی کی تقریب منعقدہ ۱۴ر اگست ۸۴ء
پر محترم پرویز صاحب کا خصوصی درس

باسمہٖ تعالیٰ

یہ وہ سحر تو نہیں!

پرویزؔ

"پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔
اس لئے اس میں اسلام نافذ ہونا چاہیئے!"

یہ نعرہ آپ کو ہر محراب و منبر ہی سے نہیں، ہر پلیٹ فارم اور اسٹیج سے، بلکہ ہر گلی کوچے سے سنائی دے گا۔ لیکن یہ نعرہ جس قدر حقیقت و صداقت پر مبنی ہے جس طرح اسے (EXPLOIT) کیا گیا ہے، وہ اتنا ہی اس کی صداقت و حقیقت کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دینے کا موجب ہے۔ پاکستان جس تشتت و انتشار کا شکار ہو رہا، اور جس طرح بے یقینی اور عدم اطمینان کا صید زبوں بن رہا ہے، وہ اسی کا نتیجہ ہے۔

جو حضرات تحریک پاکستان کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ مطالبۂ پاکستان کی اوّلین مخالفت ہندو (کانگرس) کی طرف سے ہوئی تھی۔ ان کی یہ مخالفت قابل فہم تھی۔ وہ اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام، مسلمانوں سے لینا چاہتے تھے اور اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ اس آبادی کا اتنا بڑا حصہ، نہ صرف یہ کہ ان کے پنجۂ استبداد سے رہا ہو جائے، بلکہ ان کے مدمقابل ایک آزاد مملکت قائم کر لے۔ مسلمان لیڈروں میں سے جو سیکولر نظام حکومت کے قائل تھے وہ بھی اس مخالفت میں ہندو کے ہم نوا تھے۔ لیکن سب سے زیادہ اور شدید مخالفت، اس طبقہ کی طرف سے ہوئی جو مذہبی پیشوا یا علماء کہلاتے تھے۔ ان میں سے معدودے چند ایسے تھے جنہوں نے اس مطالبہ کی تائید کی لیکن باقی سب اس کے شدید مخالف تھے۔ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ (بالفاظ دیگر مسلم لیگ)

مطالبۂ پاکستان

کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کرنا چاہتے ہیں، جہاں اسلام کی حکمرانی ہو۔ دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ علماء حضرات بھی اسلام ہی کے مدعی تھے۔ نظر بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ان دو گروہوں میں اختلاف کیوں تھا؟ اختلاف ہی نہیں بلکہ ان کی طرف سے اس مطالبہ کی اس قدر شدید مخالفت کیوں کی گئی تھی۔ چونکہ ہمارے ہاں نہ تو تحریک پاکستان کی کوئی ایسی تاریخ مدون ہوئی ہے نہ قائد اعظمؒ کی کوئی سوانح عمری جس میں ان دو گروہوں کے باہمی اختلاف، بلکہ

تصادم و تزاحم کی اصل و بنیاد کو واضح طور پر سامنے لایا گیا ہو اس لئے ہمارے عوام کی بالعموم اور نئی نسل کی بالخصوص سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نزاع کی بنیادی سبب کیا تھا۔ اور یہ سبب اب مملکت میں تشتّت و انتشار کا موجب کس طرح بن رہا ہے۔ میں نہ صرف اس جنگ کا عینی شاہد ہوں بلکہ اس میں عملاً شریک بھی تھا، اور ان دونوں گروہوں کے نزاع میں علماء کے خلاف محاذ میں میں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اس لئے مجھے معلوم ہے کہ اس نزاع اور مخالفت کا اصل سبب کیا تھا۔ اسی لئے میں وقتاً فوقتاً اس پر روشنی ڈالتا چلا آرہا ہوں۔ آج بھی میرے خطاب کا مرکزی موضوع یہی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان بھی اسلام پر مبنی تھا، اور علماء حضرات بھی اپنی مخالفت کو اسلام ہی کا تقاضا قرار دیتے تھے۔ لیکن ان دونوں میں اختلاف کا باعث ان کا، اسلام کا الگ الگ تصوّر تھا۔ اور یہ ہر دو تصوّرات باہمد گر اس قدر متضاد تھے کہ ان میں مفاہمت کی صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ جب تک ان تصوّرات کی کنہ و حقیقت کو نہ سمجھ لیا جائے، نہ ان دونوں گروہوں کی کشمکش کی علت سمجھ میں آسکتی ہے، نہ ہی پاکستان کے تشتّت و انتشار کی حقیقی وجہ۔ اس اعتبار سے آپ اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ لگا سکیں گے۔

---(٠)---

حقیقی اسلام کا تصوّر

اسلام، (جسے الدین کہہ کر پکارا گیا ہے) حضور نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوا، اور اسے قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا۔ اس اسلام کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں:۔

(۱) اسلام، (مذہب کی طرح، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حیات ہے جس کی عملی تشکیل کے لئے آزاد مملکت کا وجود لاینفک ہے۔

(۲) اس مملکت میں حقِ حکومت کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو حاصل نہیں ہوتا۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ اس کی کتاب (قرآنِ کریم) کی حکمرانی ہے۔ لہٰذا، اسلام نام ہے قرآن کی حکمرانی کا

(۳) قرآن میں (بجز معدودے چند احکام) زندگی کے عالمگیر اصول دیئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کو کس طرح بروئے کار لایا جائے گا، اسے اُمّتِ مسلمہ باہمی مشورہ سے طے کرے گی۔ لہٰذا، اسلامی مملکت اس تنظیم کا نام ہے جس کی رُو سے، اُمّت باہمی مشورہ سے، قرآنی اصول و اقدار کو عملاً نافذ کرنے کا فریضہ سرانجام دیگی۔ یہ اصول و اقدار ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ لیکن انہیں نافذ کرنے کے طور طریق جنہیں اُمّت، باہمی مشورہ سے طے کرے گی، عندالضرورت بدلتے رہیں گے۔ اسلامی مملکت اس ثبات اور تغیّر (PERMANENCE & CHANGE) کے حسین امتزاج کا نام ہے۔

(۴) ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس مملکت میں ملوکیت یا ڈکٹیٹر شپ تو کجا، مغربی انداز کی جمہوریت بھی نہیں ہوگی جس میں حقِ حکومت ایک فرد کے بجائے، افراد کے گروہ کو حاصل ہوتا ہے۔ نہ ہی اس میں مذہبی پیشوائیت

کا وجود ہوگا کیونکہ اس میں "سیاست اور مذہب الگ الگ شعبے نہیں ہوں گے۔ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے جو فیصلے مملکت کرے گی، وہی شریعت اسلامی کے احکام کہلائیں گے۔

(۵) ان خصوصیات کے باوجود، مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں ہوگا۔ مملکت، انسانیت سے متعلق

مقاصد

بلند مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوگی۔ ان مقاصد کی فہرست طویل ہے لیکن اس میں سرِ پیشانی حسبِ ذیل امور آتے ہیں:-

(i) قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، ہر شخص کو پوری پوری آزادی ہوگی۔

(ii) ہر انسان یکساں طور پر واجب التکریم ہوگا۔ تذلیلِ انسانیت، سنگین ترین جرم ہوگا۔

(iii) کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں ہوگا۔ اس طرح نہ کوئی فرد کسی دوسرے کا محتاج ہوگا نہ محکوم۔ اس سے نظامِ سرمایہ داری کا خاتمہ ہوجائے گا۔

(iv) تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے وسائل و ذرائع یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔

(v) کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن۔

یہ تھی وہ اسلامی مملکت جو ہماری تاریخ کے صدرِ اوّل میں قائم ہوئی۔ اور ہر ایک نے اسے، اس کے درخشاں انسانیت ساز نتائج سے جان اور پہچان لیا۔

اسے صدرِ اوّل کا حقیقی اسلام کہا جائے گا۔

صدرِ اوّل کے بعد

صدرِ اوّل کے اس اسلام کا دور جلدی ختم ہوگیا۔ اس کے خلاف سب سے پہلا اور شدید ترین حملہ ملوکیت کی شکل میں نمودار ہوا جس نے حقیقی اسلام کی جڑ بنیاد کو اکھیڑ کر رکھ دیا۔ آسمان کی آنکھ نے جہاں اس انقلاب کی مثال کہیں نہیں دیکھی تھی جو صدرِ اوّل کی اسلامی مملکت نے رونما کیا تھا، وہاں اس نے اس رجعت قہقہری (الٹے پاؤں پلٹ جانے) کی بھی مثال نہیں دیکھی تھی جس کا مظاہرہ صدرِ اوّل کے بعد اسی امّت نے کیا تھا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست　　　خود سرِ تختِ ملوکیت نشست!

تا نہالِ سلطنت قوّت گرفت　　　دینِ او نقش از ملوکیت گرفت

از ملوکیت نگہ گردد دگر!

عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر　　　(جاوید نامہ صفحہ ۸)

دورِ ملوکیت کا اسلام

ملوکیت جابرانہ تغلّب سے برسرِ اقتدار تو آگئی لیکن امّت کو اسلام سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس کے لئے ملوکیت کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کے اس تقاضا کو بھی پورا کیا جائے۔ اس کے لئے اس نے ثنویت (DUALISM) کا راستہ اختیار کیا۔ یعنی امورِ سیاست تو اپنے قبضے میں رکھے اور "شرعی معاملات" مذہبی پیشواؤں کے سپرد کر

دیئے۔ اس سے دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ عباسی سلاطین خود تو نسلی اعتبار سے عرب تھے لیکن ان کی سیاست، ثقافت، فلسفہ، نظریات، تصورات سب پر ایرانی فضا مسلط تھی۔ اس لئے اس دور میں اسلام کے نام سے جو تہذیب وجود میں آئی اور جو مذہب مرتب ہوا وہ سب ایرانی تصورات سے متاثر تھا۔ اقبال اس اسلام کو "عجمی اسلام" کہہ کر پکارتا ہے۔ کیا یہ حقیقت حیرت انگیز نہیں کہ (شیعوں کی تو ایک طرف رہے) خود سُنیوں کی احادیث کے چھ کے چھ صحیح ترین مجموعوں کے مرتب کرنے والے ایرانی تھے۔ اسلام کی سب سے پہلی مفصل تاریخ مدوّن کرنے والا ایرانی تھا۔ سب سے پہلی مبسوط تفسیر لکھنے والا ایرانی تھا۔ انہی احادیث، تفسیر اور تاریخ پر ہمارے مروّجہ اسلام کی بنیاد ہے۔ اسی اسلام کے متعلق اقبالؒ کہتا ہے کہ ؎

تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام (بالِ جبریل صفحہ ۱۶۵)

ہماری تاریخ کے بڑے بڑے جلیل القدر علماء و مشائخ جن کے نام "علیہم الرحمۃ" کے ساتھ لئے جاتے ہیں، اسی دورِ ملوکیت کے تھے۔ (جیسا کہ میں نے اس سے پہلے بھی ایک بار عرض کیا تھا) یہ حقیقت عجیب تحیر انگیز ہے کہ یہ حضرات یزید کے خلاف سنگین ترین جرم یہ عائد کرتے ہیں کہ اس نے ملوکیت کی بنیاد رکھی اور اس طرح اسلام کی جڑ کاٹ دی۔ ایک طرف یہ حضرات یزید کے متعلق یہ کچھ کہتے تھے اور دوسری طرف ان سلاطین کے نام خطبوں میں لئے جاتے تھے، جنہوں نے یزید کی طرح حکومت حاصل کی تھی۔ ان کے نام ہی خطبوں میں نہیں لئے جاتے تھے بلکہ محراب و منبر سے ان کے لئے خلد اللہ ملکہ اور ایدہ اللہ بنصرہ کی دعائیں بھی مانگی جاتی تھیں۔ ملوکیت کا تغلب یہ کچھ کراتا ہے۔ اسی جگر پاش حقیقت کا احساس تھا جو اقبالؒ کے لبوں پر اس نالہ و فغاں کی شکل میں آیا کہ ؎

سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوزناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر (ارمغانِ حجاز صفحہ ۲۵۹)

شہپرِ اُمت کو قفسِ ملوکیت کا خوگر بنانے کے لئے یہ علماء اور حکماء کیا کچھ کیا کرتے ہیں، اس کے متعلق اقبالؒ کہتا ہے ؎

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند — تاویلِ مسائل کا بناتے ہیں بہانہ (ضربِ کلیم صفحہ ۱۴۲)

اُس دور میں جن مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں ان کا نمونہ دیکھنا ہو تو ان کتابوں کو ایک نظر دیکھئے جنہیں ہمارے دارالعلوموں میں بطورِ نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ اسی دور میں وہ فقہیں مرتب ہوئیں جو ہزار سال سے

بادشاہوں کے حقوق

تمام مسلمان ممالک میں "شریعتِ اسلامی" کی حیثیت سے مروّج چلی آرہی ہیں۔ اس فقہ کی رُو سے، بادشاہوں کو کس قسم کے حقوق حاصل تھے اس کی دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ فقہ حنفی کی نہایت قابلِ اعتماد کتاب 'ہدایہ' میں یہ فتویٰ موجود ہے کہ

سربراہِ مملکت قتل کے سوا جو جرم بھی کرے تو اس کی کوئی سزا نہیں۔ (ہدایہ اوّلین مجیدی۔ صفحہ ۴۹۳)

امام ابوبکر جصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "محدثین کے ایک گروہ کا عقیدہ تھا کہ بادشاہ وقت سے ظلم و جور اور بے گناہ لوگوں کے قتل وغیرہ جرائم کا ارتکاب ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا بھی شرعاً جائز نہیں"۔ (احکام القرآن - جلد ۲ صفحہ ۴۳) حتیٰ کہ یافعی نے اپنی تاریخ میں، یزید بن عبدالملک کے زمانے کا واقعہ نقل کیا ہے کہ چالیس شیوخ نے آکر اس امر کی گواہی دی کہ سلاطین قیامت کے دن بغیر حساب کے بخشے جائیں گے۔ (تاریخ الیافعی صفحہ ۲۳۴ - ۱/۲)۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں شخصی حکومتوں کے سربراہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ ظل اللہ علی الارض (وہ زمین پر خدا کا سایہ) ہوتے ہیں۔

مولویت اور مذہبی پیشوائیت کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ امت کے سامنے قرآن نہ آنے پائے کیونکہ اس کی روشنی میں یہ سازشیں ایک ثانیہ کیلئے بھی ٹھہر نہیں سکتی تھیں۔ لیکن اُمت کو قرآن کے ساتھ بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ اس کے اسی جذبہ کی تسکین کے لئے عقیدہ یہ پیدا کر دیا کہ شریعت کے لئے فقہ اور احادیث کافی ہیں۔ اور قرآن صرف تلاوت کے لئے ہے جس سے اجرِ عظیم ملتا ہے۔

اس طرح امت کو آہستہ آہستہ، صدرِ اوّل کے اسلام کے بجائے اس عجمی اسلام کا اس قدر خوگر بنا دیا گیا کہ وہ اسی اسلام کو حقیقی اسلام سمجھنے لگی۔ اگر کوئی حقیقی اسلام کا نام لیتا تو اسے ملحد، بے دین، مرتد قرار دے دیا جاتا۔ اس طرح: ؎

تھا جو "ناخوب" بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر! (ضربِ کلیم ص)

ضمیر کس حد تک بدل جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آج جبکہ دنیا کی غیر مسلم مملکتیں شخصی حکومتوں کو ختم کر رہی ہیں، یہ اگر شخصی طور پر قائم ہیں تو مسلمانوں کے ممالک میں۔ قائم ہی نہیں،

شخصی حکومتیں

انہیں تقدس حاصل ہے ——— پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب مغربی قوتوں نے ترکی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ کمال اتاترک اور ان کی پارٹی نے شخصی حکومت کو ختم کرکے جمہوری نظام رائج کرنے کی کوشش کی تو مسلمانوں کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ اتاترک کے خلاف یہ جرم عائد کیا گیا کہ وہ "خلافت" کو مٹا رہا ہے۔ حالانکہ اس حکومت کو صدرِ اوّل کی خلافت سے کیا نسبت تھی؟ یہ تو شخصی موروثی حکومت تھی۔ لیکن چونکہ اس کا نام "خلافت" رکھ دیا گیا تھا اس لئے اسے قائم رکھنا مذہبی فریضہ قرار دیا گیا۔ حتیٰ کہ ہندوستان میں "تحریکِ خلافت" کے عنوان سے ملک گیر ایجی ٹیشن اٹھی اور لندن تک وفود بھیجے گئے کہ ترکی کی موروثی شخصی حکومت کو قائم رکھا جائے۔ ہر چند مغربی انداز کی اتاترک کی جمہوریت بھی مطابقِ اسلام نہ تھی لیکن شخصی حکومت سے تو بہرحال بہتر تھی۔ لیکن مسلمان اس تبدیلی کو بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔۔۔۔ یوں "غلامی میں قوموں کا ضمیر بدل جاتا ہے"۔

بہرحال، یہ تھا وہ مذہب جو اسلام کے نام سے ہمارے ہاں متوارث چلا آ رہا تھا (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) اس سے مفہوم تھا چند عقائد، اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ارکان اور نکاح، طلاق وغیرہ سے متعلق

مسائل۔ اگر مسلمانوں کو ان کی آزادی حاصل تھی تو انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ کس قسم کی (اپنوں یا غیروں کی) حکومت کے تابع زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس "اسلام" کا امورِ مملکت سے کچھ واسطہ نہیں تھا۔ انگریزوں نے ہندی مسلمانوں کو اس اسلام کی آزادی دے رکھی تھی تو وہ مطمئن تھے۔ اُن کی حکومت کے خلاف تحریک اٹھی تو وہ سیاسی آزادی کے لئے تھی۔ اسلام کا اس سے کچھ تعلق نہیں تھا۔ ہندو ..... اطمینان دلا رہا تھا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد، مسلمانوں کو اسلام کی ویسی ہی آزادی حاصل ہوگی جیسی انگریز کے عہدِ حکومت میں تھی۔ وہاں کے علماء کرام اس سے خوش تھے اور تحریکِ آزادی میں ہندوؤں (کانگریس) کے ساتھ تھے۔

(۶)

اقبالؒ کا احسان

اقبالؒ کا ملتِ اسلامیہ پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اس حقیقت کو بہ تکرار و اصرار واضح کیا کہ جو اسلام ہم میں متوارث چلا آ رہا ہے، اور جس کی علمبردار ہماری مذہبی پیشوائیت ہے۔ وہ، وہ اسلام نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا، اور جو ہمارے صدرِ اوّل میں قائم ہوا تھا۔ مروجہ اسلام وہ ہے جو ہمارے عہدِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا اور جسے مذہبی پیشوائیت متواتر آگے بڑھائے چلی آ رہی ہے۔ صدرِ اوّل کا اسلام، اس مملکت میں قائم ہو سکتا ہے جس میں قرآن، اور صرف قرآن کی حکمرانی ہو۔ اس کے نہایت مختصر، لیکن بیحد جچے تلے الفاظ میں:۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(اگر تو مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے قرآن کے سوا کوئی طریق نہیں)۔

اس نے کہا کہ ہمارا مروجہ اسلام، عربی ملوکیت کا وضع کردہ مذہب ہے، اور جب ملوکیت ہی اسلام کی ضد ہے تو اس کا وضع کردہ مذہب کس طرح اسلامی قرار پا سکتا ہے؟ زہریلے دودھ کی دہی اور بالائی بھی زہریلی ہوگی۔ لہٰذا حقیقی اسلام کے احیاء اور قیام کے لئے ضروری ہے کہ مروجہ ملوکیتی اسلام کو ختم کر دیا جائے۔

تصورِ پاکستان

اقبالؒ نے اس تصوّر کو محض نظریہ کے طور پر پیش نہیں کیا۔ اس نے اس کی عملی تشکیل کا راستہ بھی متعیّن کر دیا۔ اس نے (۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں) کہا کہ اس کے لئے قدم اوّل مسلمانوں کی ایسی آزاد مملکت کا قیام ہے جس میں ملوکیتی اسلام کی جگہ قرآنی اسلام نافذ کیا جا سکے۔ انہوں نے کہا تھا کہ

> اس مملکت کے قیام سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف اس کی صحیح

معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔
اس سے بھی پہلے، انہوں نے (اپنے خطبات تشکیلِ جدید کے چھٹے خطبہ میں) سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہم نوائی میں کہا تھا کہ

> ہمارے لئے رشاد کی ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ جس جامد ہو کر رہ گیا ہے، انہیں کھرچ کھرچ کر الگ الگ کر دیا جائے، اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

اسی خطبہ میں انہوں نے، قانون سازی کے سلسلہ میں کہا تھا کہ اس جمود کا بنیادی سبب وہ فقہی قوانین ہیں جو ہمارے دورِ ملوکیت میں، ہزار سال پہلے مدوّن ہوئے تھے، اور جنہیں ابدی اور ناقابلِ تغیر و تبدل قرار دے دیا گیا ہے۔ ان قوانین کی جگہ، قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اُمت کے مشورہ سے ایسے قوانین مرتب کئے جائیں گے جو عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس دشوار گذار مرحلہ کو وہی بطلِ جلیل طے کر سکے گا جو عمر (رضی فاروق) کی سی جرأتِ ایمان کے ساتھ، یہ کہتا ہوا اس فریضہ کو اپنے ذمے لے کہ

حسبنا کتاب اللہ

تمہارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

وہ جانتے تھے کہ اس تحریک کی سب سے زیادہ شدید مخالفت، مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہو گی۔ کیونکہ اس سے نہ صرف ان کا اقتدار چھن جائے گا بلکہ اس انسٹی ٹیوشن کا وجود تک

مولوی حضرات کا چنگل

باقی نہیں رہے گا۔ اسی لئے انہوں نے قوم کو وارن کیا تھا کہ ان کے تسلط سے پیچھا چھڑانا ازبس ضروری ہے۔

انہوں نے اکبر شاہ خان صاحب (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا:۔

> آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ پیشہ ور مولویوں کا اثر سر سید احمد خان کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا لیکن خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتوؤں کی خاطر ان کا اقتدار، ہندی مسلمانوں میں مکرر سے قائم کر دیا۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسہ میں پڑھا گیا...... (اس پر) بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔
>
> (انوارِ اقبال ؒ۔ صـ ۲۱۷۔)

اس کے بعد انہوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس (منعقدہ مارچ ۱۹۳۲ء) میں اپنے خطبۂ صدارت

کے دوران فرمایا:۔

> تمہارے دین کی یہ بلند فطرت ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے۔ اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات اور جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جسے صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر رکھا ہے۔ ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانۂ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں، اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

ان حضرات کی طرف سے کفر کے فتوے تو ان کے ترکش کے اوّلیں تیر ہوتے ہیں، لیکن اُس زمانے میں ان سے بھی زیادہ مؤثر اور کارگر ایک اور حربہ تھا۔ لوگوں کے دلوں میں انگریز کے خلاف نفرت اس قدر شدید تھی کہ اگر کسی کے متعلق کہہ دیا جاتا کہ وہ "انگریز نواز" ہے تو عوام — "ٹوڈی بچہ، ہائے ہائے" کے نعروں سے اس کی زندگی اجیرن کر دیتے۔ چنانچہ ان حضرات نے سب سے پہلے یہی حربہ استعمال کیا۔ اور اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ دونوں کے متعلق مشہور کر دیا کہ یہ انگریز کے پٹھو ہیں۔ اور ان کی تحریکِ پاکستان، "درحقیقت انگریز کی تخلیق ہے۔(مولانا) حسین احمدؒ (مدنی) — دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، اور اس زمانے کی جمعیت العلماءِ ہند کے صدر —

مخالفت

اس باب میں پیش پیش تھے۔ وہ کہتے تھے کہ

> جو لوگ مسلمانوں کو اس میدانِ سیاست (یعنی کانگریسی میدانِ سیاست) میں آنے سے روک رہے ہیں اور متحدہ قومیت کی بھیانک صورت ظاہر کر کے نفرت دلا رہے ہیں، بلاشک وشبہ برطانیہ کی ایسی عظیم الشان خدمات انجام دے رہے ہیں جو اس کی افواج اور اسلحہ سے بھی انجام نہیں پا سکتیں۔ (پمفلٹ متحدہ قومیت اور اسلام ۔ ص[illegible])

انہوں نے علامہ اقبالؒ کا نام لے کر کہا:۔

> الغرض جادوگرانِ برطانیہ نے اپنی ساحرانہ کارگذاریوں سے سر سید جیسے تجربہ کار، عقلمند شخص کو نہ صرف متحدہ قومیت سے بلکہ پالٹیکس اور آئینی جدوجہد سے بھی روکا اور اس کے ذریعے مسلمانوں کو ہمیشہ سیاست سے الگ رکھوا کر بالکل نابلد اور ڈرپوک بنا دیا۔ پھر اگر ڈاکٹر اقبالؒ مرحوم اس سحر سے مسحور ہیں تو کیا تعجب ہے۔ (ایضاً ص ۴۲)

اس کے بعد ان کی طرف سے حسبِ عادت کفر کے فتوؤں کی یلغار شروع ہو گئی۔ اور مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دیا گیا۔

ہندی اسلام

سوال یہ ہے کہ اس مخالفت کے حق میں یہ حضرات دلیل کیا دیتے تھے؟ وہی جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ یعنی یہ کہ جب ہندوستان کی آزاد

مملکت میں، مسلمانوں کو مذہب کی آزادی حاصل ہوگی تو پھر اس مقصد کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا مطالبہ یکسر غیر اسلامی اور سازش ہے۔ (مولانا) حسین احمد (مدنی۔ مرحوم) ارشاد فرماتے تھے:۔

ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے، سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی، اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے۔ (زمزم۔ مورخہ ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

مذہبی آزادی کے متعلق وہ فرماتے تھے:۔

کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔

(مولانا مدنی کا پمفلٹ۔ متحدہ قومیت اور اسلام۔ ص۶۱)

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ (جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے) یہ جنگ درحقیقت اسلام کے دو تصورات کے درمیان تھی جو ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ایک تصور اقبالؒ کا پیش کردہ تھا جو صدرِ اوّل کا قرآنی اسلام (الدین) تھا۔ اس کے برعکس، دوسرا تصور اس عجمی اسلام کا تھا جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا اور جس کی علمبردار ہماری مذہبی پیشوائیت تھی۔ علامہ اقبالؒ کی وفات سے چند ماہ پیشتر (جنوری ۱۹۳۸ء میں) ان کے اور مولانا مدنی (مرحوم) کے درمیان ایک معرکہ آراء تحریری مباحثہ ہوا تھا جسے حضرت علامہؒ نے "معرکۂ دین و وطن" کے عنوان سے تعبیر کیا تھا۔ اس میں ان ہر دو تصورات کے تضاد پر بڑی اہم گفتگو ہوئی تھی۔ علامہ کا وہ بیان درحقیقت، مملکتِ پاکستان کا منشور تھا۔

(۰)

قائدِ اعظمؒ

علامہ اقبالؒ کے بعد، قائدِ اعظمؒ اس میدان میں شرکت فرما ہوئے تو دین کا حقیقی تصور اور بھی نمایاں ہو کر سامنے آ گیا۔ اقبالؒ کی طرح انہوں نے بھی اس کے ــــ منفی اور مثبت ــــ دونوں گوشے اجاگر کئے۔ منفی حیثیت سے انہوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اس مملکت میں مذہبی پیشوائیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ انہوں نے ۵ فروری ۱۹۴۸ء کو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے، نوجوان طالب علموں سے کہا کہ

مسلم لیگ نے کم از کم ایک کام تو کر دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خود غرضی کا مفاد پرستانہ کھیل کھیل رہے ہیں، وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس نے بلاشک و شبہ تمہیں اس ناخوش آئندہ، غیر مطلوب عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔ (تقاریر قائدِ اعظمؒ۔ حصہ اوّل ص۴۸)

اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے مختلف مواقع پر اس کا اعلان کیا کہ اس مملکت میں تھیاکریسی

نہیں ہوگی۔ انہوں نے ۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک اسٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔

(تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۸۶)

انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی اس حقیقت کو علی الاعلان واضح کیا تھا کہ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا تھا کہ

پاکستان کی مجلسِ قانون ساز نے ابھی پاکستان کا دستور مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی آخری شکل کیا ہوگی۔۔۔۔ کچھ بھی ہو، یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(تقاریر بہ حیثیت گورنر جنرل۔ صفحہ ۶۵)

چونکہ ہمیں ہنوز (پورے طور پر) تھیاکریسی سے واسطہ نہیں پڑا اس لئے اسے نہ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اندازِ حکومت کس قسم کا ہوتا ہے، نہ ہی اس کا (کماحقہ) احساس کر سکتے ہیں کہ یہ کس قدر انسانیت سوز ہوتا ہے۔ اس میں فیصلے مذہبی پیشوا ہی کے ہوتے ہیں لیکن ان کا نفاذ حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔

تھیاکریسی کیا ہوتی ہے

(مثلاً) اگر انہوں نے کہہ دیا کہ کل عید نہیں ہوگی تو حکومت کا محکمۂ فلکیات لاکھ اس کی تردید کرے، حکومت انہی کے فیصلہ کو نافذ کرنے پر مجبور ہوگی۔ دوسری طرف حکومت بھی ان سے اپنے بڑے بڑے کام لیتی ہے۔ (مثلاً) اس نے کوئی ایسا قدم اٹھانا ہو جس کے متعلق عوام کی مخالفت کا ڈر ہو، تو وہ مذہبی پیشوائیت سے اس کے، مطابقِ شریعت ہونے کا فتویٰ حاصل کر لیتی ہے۔ اس کے بعد کسی کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ اس کی مخالفت کرے۔ حتیٰ کہ اگر حکومت کو اپنے کسی مخالف کو راستے سے ہٹانا ہو تو مذہبی پیشوائیت اس کے مرتد ہونے کا فتویٰ صادر کر دیتی ہے۔ اس کے بعد حکومت مزاحیت، اطمینان سے اس کا سر اڑا سکتی ہے۔ کوئی اس کے خلاف لب کشائی تک نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی مخالفت سے اس کے خود اپنے مرتد قرار دئے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ یہ ہوتی ہے مختصر الفاظ میں تھیاکریسی ——— یعنی مذہبی پیشوائیت کی حکومت ——— نوعِ انسان کی تاریخ میں، ان ادوار سے بدتر کوئی دور نہیں ملے گا جن میں کسی بدنصیب ملک میں تھیاکریٹک نظامِ حکومت نافذ رہا ہو۔ یہ تھا مذہبی پیشوائیت کے تصور کا وہ اسلام، جسے ختم کرنے کے لئے حصولِ پاکستان کے لئے جدوجہد کی جا رہی تھی اور جس کی سخت مخالفت وہاں کے علماء کی طرف سے ہوئی تھی۔

اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے تصور کے اسلام کا یہ منفیانہ پہلو تھا۔ جہاں تک اس کے مثبت پہلو کا تعلق ہے

قائدِ اعظمؒ نے اسے اس طرح متعین اور واضح کیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے متعلق عام تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ (بقول ان معترضین کے) "سوٹڈ۔ بوٹڈ۔ انگلینڈ ریٹرنڈ۔ صاحب بہادر تھا...." اسے اسلام اور اس کے حقائق سے کیا واسطہ؛ اس مقام پر میں، اپنا نام درمیان میں لانے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ قائدِ اعظمؒ کے متعلق میں جو کچھ عرض کرتا رہتا ہوں وہ میری شنید نہیں، دید ہے۔ مجھے ان سے قریب دس سال تک ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ میرے اور ان کے درمیان وجہِ اشتراک، قرآن کریم تھا۔ میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر شہادت دے سکتا ہوں کہ قرآنی حقائق اور دین کے اصول و اقدار، ان کے قلب کی گہرائیوں میں اترے ہوئے تھے، اور چونکہ وہ بے حد ذہین اور ذکی قانون دان تھے اس لئے انہیں فکری طور پر بھی اس کا خاص شعور و ادراک حاصل تھا کہ اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیات کیا ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں، میں ان کے متعدد ارشادات پیش کر سکتا ہوں، لیکن ان کا ایک تجزیہ اس قدر جامع اور منفرد ہے کہ اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور یہ تجزیہ وہ ہے جو انہوں نے ۱۹۴۱ء میں حیدر آباد (دکن) کی عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا کے ایک سوال کے جواب میں برجستہ ارشاد فرمایا تھا۔

اسلامی مملکت کا تصوّر

طلباء نے پوچھا یہ تھا کہ جسے آپ اسلامی مملکت کہتے ہیں، اور جس کے حصول کے لئے آپ مصروفِ جدّ و جہد ہیں، اس کی امتیازی خصوصیت کیا ہے۔ یعنی اسلامی مملکت، دیگر انواعِ مملکت سے کس طرح منفرد اور مختلف ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ

> اسلامی مملکت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ، قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

اس تجزیہ کی جامعیت کے متعلق کہنے کو تو کیا کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن میں صرف دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ .... کہ ہمارے ہاں کے متقدمین اور آج تک کے متاخرین نے اسلامی مملکت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں کسی جگہ کوئی تحریر بھی ایسی نہیں ملے گی جس میں اسلامی مملکت کا امتیازی اور منفرد تصوّر اس اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔ یہ تھا (بقول معترضین) "اسلام سے بے بہرہ، سوٹڈ بوٹڈ۔ صاحب بہادر" محمد علی جناحؒ! اقبالؒ نے جو کچھ اپنے متعلق کہا تھا وہی کچھ قائدِ اعظمؒ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ گرچہ سر تراشند، قلندری داند۔

دوسری بات یہ کہ اس پینتیس سال کے عرصہ میں، پاکستان میں (اور بیرونِ پاکستان) قائدِ اعظمؒ

کے متعلق سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ ہزاروں آرٹیکل شائع ہوئے۔ لاتعداد کانفرنسیں، سیمینار، مذاکرات منعقد ہوئے۔ ان کی سالگرہیں اور برسیاں منائی گئیں۔ کیا آپ نے ان میں کسی جگہ قائداعظمؒ کے انٹرویو کے اس اقتباس کو لکھا یا کسی مقرر کی زبان سے سنا ہے؟ آپ سوچئے کہ یہ کتنی گہری سوچ کا مقام ہے۔ ایسا سہواً نہیں ہوا، دانستہ کیا گیا ہے۔ یہ دلخراش حقیقت ایک گہری سازش کی غمازی کرتی ہے۔ وہ سازش جس کا ذکر ابھی آپ کے سامنے آئے گا۔

(٠)

پاکستان وجود میں آگیا اور بظاہر ایسا دکھائی دیا کہ اسلام کے اس تصور کو فتح حاصل ہو گئی ہے جسے اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد کے طور پر پیش کیا تھا۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ تقسیم ہند سے یہاں ایک خطۂ زمین حاصل ہوا تھا جس میں ایسی مملکت قائم کرنا مقصود تھا جس میں اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے تصور کے اسلام (یعنی صدرِ اوّل کے قرآنی اسلام) کو عملاً نافذ کیا جا سکتا...... اس اسلام کو فتح اس وقت نصیب ہوتی تھی جب وہ یہاں عملاً نافذ ہو جاتا۔ جس مذہبی پیشوائیت کے تصورِ اسلام کو درنظر بظاہر شکست ہوئی تھی اسے اس کا علم تھا کہ شکست و فتح کا آخری فیصلہ ہونا ہنوز باقی ہے۔ اقبالؒ تشکیلِ پاکستان سے پہلے ہی ہم سے رخصت ہو چکا تھا۔ قائداعظمؒ محض زندگی کے سانس پورے کرنے کے لئے ہم میں رہے۔ ان شکست خوردہ نبرد آزماؤں نے دیکھا کہ میدان خالی ہے تو وہ یلغار کر کے یہاں آگئے اور آتے ہی یہ نعرہ بلند کیا کہ

پاکستان، اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے
یہاں اسلام نافذ ہوگا۔

یہاں کوئی نہیں تھا جو ان سے پوچھتا کہ آپ یہاں کونسا اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اسلام سے بہر نوع ان کی مراد وہی اسلام تھا جسے مٹانے کے لئے مملکتِ پاکستان وجود میں آئی تھی۔

مذہبی پیشوائیت کی یلغار

اس یلغار کی روک تھام، اقبالؒ اور جناحؒ کے قد و قامت کا کوئی لیڈر ہی کر سکتا تھا۔ ایسا لیڈر یہاں کوئی نہیں تھا۔ جو لیڈر، اقبالؒ اور جناحؒ کی جانشینی کے مدعی تھے، ان میں اکثریت ان کی تھی جو ان ہر دو اسلاموں کے فرق کو جانتے نہیں تھے۔ جو دو چار اسے جانتے تھے انہوں نے دبے دبے سروں میں اس کے خلاف آواز اٹھائی تو ان کے خلاف اس قدر شدید پراپیگنڈہ کیا گیا کہ نہ انہوں نے اس باب میں دوبارہ لب کشائی کی، نہ اوروں نے اس کی جرأت۔ یہ حضرات قدم اوّل ہی میں تھیا کریسی کا مطالبہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت رفتہ رفتہ اس تک پہنچے۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ مطالبہ پیش کیا کہ مملکت کے قوانین کتاب و سنت کے مطابق ہونے چاہئیں۔ حالانکہ اس مطالبہ کے پیش کرنے والے اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے کہ ہر فرقہ کی سنت الگ الگ ہے اس لئے سنت کی بنا پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم

کرلیں۔ اس کے باوجود یہ لوگ اپنے اس ناقابلِ عمل مطالبہ پر زور دیتے جاتے تھے کہ مملکت کا ضابطہ قوانین کتاب وسنت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس مطالبہ کے بہ تسلسل پیش کئے جانے سے مقصد یہ تھا کہ عوام میں مشہور کیا جائے کہ اربابِ اقتدار یہاں اسلام نافذ نہیں کرنا چاہتے۔

صدر ایوب مرحوم

اگر اسلام نافذ ہوگا تو مذہبی پیشوائیت کے ہاتھوں ہی ہوگا۔ صدر ایوب نے ایک دفعہ "غلطی سے" یہ کہہ دیا کہ

> اپوزیشن کے رہنماؤں کی طرف سے جو اعتراضات موجودہ حکومت پر کئے جا رہے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔ یہ ایک جذباتی، پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ اگر مسلمانوں میں موجودہ فرقے موجود نہ ہوتے، جس طرح خدا اور رسولؐ کی منشا تھی، تو یہ معاملہ آسان ہو جاتا۔ میں نے علماء سے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے اسلامی قانون تیار کریں، اور اس کی منظوری وکلاء اور جج صاحبان سے حاصل کریں، کہ یہ لوگ قانون کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ اسے اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کی منظوری بھی حاصل کریں۔ اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اس قانون پہ دستخط کر دوں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ملک میں اسلامی قانون رائج ہو۔ میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں۔ (نوائے وقت۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۸ء)

اگر یہ حضرات اپنے مطالبہ میں ذرا بھی دیانتدار ہوتے تو انہیں صدرِ مملکت کی اس پیش کش پر فوراً لبیک کہنا چاہیئے تھا۔ لیکن اس سے ان کی سازش کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ لہٰذا، اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ "یہ شخص بدنیت ہے اور علماء کے اختلاف کو خواہ مخواہ سپر بنا رہا ہے۔" (نوائے وقت ۲۰ جنوری ۱۹۶۹ء)۔

بیس برس تک ان لوگوں نے یہ پروپیگنڈہ جاری رکھا اور اس کے بعد ایک اور قدم آگے بڑھایا۔ اس مطالبہ کے پیش کرنے والوں میں سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) سرفہرست تھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ

> کتاب وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاء کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (ایشیا۔ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ ان اکتیس علماء میں سے، جنہوں نے بیس سال پہلے کتاب و سنت کے مطابق قوانین مرتب کرنے کا مطالبہ پیش کیا تھا، کسی ایک نے

ناممکن العمل

نہ تو مودودی صاحب کے اس اعلان کی تردید کی اور نہ ہی ان سے یہ تک پوچھا کہ جب یہ مطالبہ ناممکن العمل تھا تو اسے پیش کیوں کیا گیا تھا؟ اس سے واضح ہے کہ ان سب کو معلوم تھا کہ یہ مطالبہ ناممکن العمل ہے۔ اور حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کا حربہ..... اس کے بعد جب مرحوم سے پوچھا گیا کہ جب کتاب وسنت کی رو سے کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا، تو پھر قانون سازی کی صورت کیا ہوگی۔ فرمایا کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔

حالانکہ وہ خود فقہ کے سخت مخالف تھے۔ اس کے متعلق ان کے نظریات یہ تھے:۔

(۱) مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو، زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا۔ اس کے اجتہادات کا تمام زمانوں میں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے

(تفہیمات۔ حصہ دوم۔ پانچواں ایڈیشن۔ صفحہ ۴۲۶)

(۲) بزرگانِ سلف کے اجتہادات نہ تو اٹل قانون قرار دیئے جا سکتے ہیں اور نہ سب سے سب دریا بُرد کر دینے کے لائق ہیں۔ صحیح اور معتدل مسلک یہی ہے کہ ان میں ردّوبدل کیا جا سکتا ہے۔

مودودی اور فقہ حنفی

(رسائل و مسائل۔ جلد دوم۔ ایڈیشن ستمبر ۱۹۶۹ء۔ صفحہ ۲۸۲)

(۳) یہ سلف کونسے انبیاؑ تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے۔

(تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۱۳۷)

(۴) بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ)

(۵) میں نہ مسلکِ اہلِ حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اور نہ حنفیت یا شافعیت ہی کا پابند ہوں۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل۔ ستمبر ۱۹۵۱ء ایڈیشن۔ صفحہ ۲۳۵)

(۶) میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ۔ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۴۴)

(۷) انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔

(تنقیحات۔ پانچواں ایڈیشن۔ صفحہ ۱۲۰)

یہ تھی وہ فقہ جسے مملکتِ پاکستان کا ضابطہ قوانین بنانے کی تجویز مودودی مرحوم نے کی تھی۔ بات واضح ہے۔ جس طرح، وہ یہ جانتے ہوئے کہ کتاب و سنت کی رُو سے کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا، کتاب و سنت کو ضابطہ قوانین بنانے پر بیس سال زور دیتے رہے، اسی طرح انہوں نے یہ جانتے ہوئے کہ فقہ ایک "منجمد شاستر" ہے، اسے بطور ضابطہ قوانین بنانے کی تجویز کر دی۔ اس فقہ کے عملاً نافذ ہونے پر ملک کی جو حالت ہونی تھی، وہ تو ایک طرف رہی، جو فرقے فقہ کو اسلامی شریعت تسلیم نہیں کرتے تھے انہوں نے اُسی زمانے میں اس کی مخالفت شروع کر دی جس سے ملک میں تشتت و انتشار پھیل گیا۔ اس پر مودودی مرحوم سے پوچھا گیا کہ اس مسلسل اضطراب اور انتشار کا آخر حل کیا ہے، تو انہوں نے فرمایا کہ

تھیا کریسی

میں واضح طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے، اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو، جو اسلام کو جانتے بھی ہیں۔ دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں اور جس روز اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے گا اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے۔

(ایشیا - ۹ مئی ۱۹۷۶ء)

یہ تھیا کریسی کے عملی قیام کی تجویز تھی۔ اس وقت بھٹو حکومت کا آخری دور تھا۔ وہ سلسلہ ... تم رہتا تو معلوم اس کے بعد کیا (DEVELOPMENT) ہوتی لیکن ۱۹۷۷ء کی عسکری حکومت نے اس دور کا خاتمہ کر دیا۔ جنرل ضیاءؔ نے برسرِ اقتدار آتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ ان کا مقصد ملک میں اسلامی نظام اور اسلامی قوانین کا نفاذ ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے پیشِ نظر علماء حضرات والا اسلام ہی ہو سکتا تھا۔ ہم کسی کی نیت پر شبہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہو سکتا ہے کہ جنرل موصوف نیک نیتی سے اسی اسلام کو حقیقی اسلام سمجھتے ہوں۔ لیکن اگر وہ نیک نیتی سے ایسا سمجھتے ہیں تو، اور (اگر بفرضِ محال) ..... وہ اسے مذہبی پیشوائیت کی مخالفت کی روک تھام کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو نتیجہ بہر صورت یکساں ہے۔ کسی کو سنکھیا نیک نیتی سے کھلا دیجئے یا بدنیتی سے اسے مارنے کے لئے، دونوں صورتوں میں نتیجہ اس کی ہلاکت ہو گا۔ اتنا تو بہرحال واضح ہے کہ جنرل موصوف خود بھی اسے ناممکن العمل تسلیم کرتے ہیں۔ اس اسلام کی پہلی قسط، حدود (سزاؤں سے متعلق قانون) کا نفاذ تھی۔ ان کے متعلق وہ متعدد بار اعلان کر چکے ہیں کہ ان پر عمل درآمد ناممکنات میں سے ہے۔ وجہ اس کی ظاہر ہے۔ یہ قوانین، ہزار سال پہلے کے دورِ ملوکیت کے وضع کردہ ہیں۔ یہ نہ قرآن کے مطابق ہیں۔ نہ دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق۔ انہیں ناقابلِ تغیر و تبدل سمجھنا بنیادی غلطی ہے۔

اسلام کا یہ تصور کس طرح حقیقی اسلام کے خلاف ہے، ہم سرِدست اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے، لیکن کم از کم اتنا تو واضح ہے کہ اسلام کا جو تصور اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے پیش کیا تھا اور جسے نافذ کرنے کے لئے انہوں نے مملکتِ پاکستان کو حاصل کیا تھا، جو اسلام، یہاں نافذ کیا جا رہا ہے، یہ وہ اسلام تو نہیں۔ یہ حقیقت بڑی تعجب انگیز ہے کہ یہ حضرات اٹھتے بیٹھتے یہ کہتے رہتے ہیں کہ ہمیں اقبالؒ کے افکار سے راہ نمائی حاصل کرنی چاہیئے اور قائدِ اعظمؒ کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے اور نافذ اس اسلام کو کر رہے ہیں جسے ختم کرنے کے لئے اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے مملکتِ پاکستان کی تشکیل کی تھی!

(۰)

فقہی اسلام کی چند مثالیں

جس قسم کا اسلام یہاں نافذ کیا جا رہا ہے اس سے معاشرہ کا نقشہ کس قسم کا ہو گا، اس کی تفاصیل تو طول طویل ہیں جن کی یہاں گنجائش نہیں۔ ہم صرف دو چار نقاط پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان کے لئے حوالے مودودی مرحوم کے دیئے جائیں گے کیونکہ یہاں کی "شریعت" انہی کے نظریات کے گرد گردش کر رہی ہے۔

سب سے پہلے تو یہ کہ اس میں جھوٹ بولنا شرعاً عام ہو جائے گا۔ عام ہی نہیں بلکہ واجب۔ مودودی مرحوم کا ارشاد ہے:۔

راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور

جھوٹ جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب (واجب ہونے) تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء۔ صـ۵۳)

علماء حضرات میں سے اس کی تردید یا مخالفت کسی نے نہیں کی۔

(۲) عصرِ حاضر میں جنسیات نے خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اس باب میں ان کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) نابالغ لڑکیوں سے نہ صرف نکاح جائز ہے بلکہ ان کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔

(تفسیر تفہیم القرآن۔ جلد پنجم۔ صـ۵۷۔ نیز ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء)

جنسیات نابالغ لڑکیوں سے خلوت (یعنی جنسی اختلاط!!)۔

(۳) ان سے دریافت کیا گیا کہ جنت کی حوریں کون ہوں گی۔ جواب دیا:۔ کفار کی لڑکیاں جو کمسنی میں وفات پا گئی ہوں گی، انہیں جنت میں حوریں بنا دیا جائے گا۔ (ایشیا۔ ۱۴ جون ۱۹۶۹ء)۔ اہلِ جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں (محلات) میں رہیں گی اور ان کی سیرگاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔ (تفہیم القرآن۔ جلد پنجم۔ صـ۲۷)

کفار کی کم سن لڑکیاں مومنین کے تصرف میں!

(۴) مشت زنی کے متعلق انہوں نے فرمایا:۔

صحیح مسلک تو یہی ہے کہ یہ فعل حرام ہے۔ البتہ عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ اس کی حرمت، زنا اور عملِ قومِ لوط اور وطیٔ بہائم کی بہ نسبت کم تر ہے۔ اس لئے اگر کسی شخص کو ان گناہوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اور اس سے بچنے کے لئے وہ اپنے جوشِ طبع کی تسکین اس ذریعہ سے کر لے تو اس کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اسے سزا نہ دے۔ (رسائل و مسائل۔ جلد دوم۔ صـ۲۰۲)

خدا ایسے حالات میں ضبطِ نفس کا حکم دیتا ہے۔

(۵) متعہ کے متعلق ارشاد ہے:۔

فرض کیجئے کہ ایک جہاز سمندر میں ٹوٹ جاتا ہے اور ایک مرد اور عورت کسی تختے پر بہتے ہوئے کسی ایسے سنسان جزیرہ میں پہنچ جاتے ہیں جہاں کوئی آبادی موجود نہ ہو۔ وہ ایک ساتھ رہنے

پر مجبور ہیں۔ اور شرعی شرائط کے مطابق ان کے درمیان نکاح بھی ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ باہمی خود ہی ایجاب و قبول کر کے اس وقت تک کے لئے عارضی نکاح کر لیں جب تک وہ آبادی میں نہ پہنچ جائیں یا آبادی ان تک نہ پہنچ جائے۔ کم و بیش ایسی ہی اضطراری صورتیں اور بھی ہو سکتی ہیں۔ متعہ اسی طرح کی اضطراری حالت کے لئے ہے۔ (ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۵۵ء)

اسی قسم کے نظریات پر مبنی قوانین مرتب ہو جائیں گے۔

۶۔ لونڈیاں

لونڈیوں کے متعلق ہماری فقہ کی کتابوں میں بڑی تفصیل سے احکام آئے ہیں۔ مودودی مرحوم نے بھی اس سلسلہ میں خاصی طویل بحث کی ہے۔ جاہلیت عرب میں جنگ میں گرفتار شدہ مردوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا کرتے تھے۔ قرآن کریم نے ان غلاموں اور لونڈیوں کو جو نزول قرآن کے زمانے میں عربی معاشرہ میں موجود تھے، آہستہ آہستہ معاشرہ کا جزو بنا لینے کے احکامات صادر فرمائے اور آئندہ کے لئے یہ دروازہ یہ کہہ کر بند کر دیا کہ ان قیدیوں کو یا تو فدیہ لے کر رہا کر دینا ہو گا اور یا احسان رکھ کر (۴۷/۴)۔ لیکن ہمارے دور ملوکیت نے اس بند دروازے کو چوپٹ کھول دیا، اور غلام اور لونڈیاں ان کے ہاں عام ہو گئیں۔ فقہ نے یہ اجازت عام کر دی۔ دنیا غلامی کی لعنت کو ختم کر رہی ہے لیکن ہمارے ارباب شریعت اسے عین مطابق اسلام قرار دے رہے ہیں۔ مودودی مرحوم نے اپنی کتاب تفہیمات حصہ دوم۔ اور اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں بڑی وضاحت سے ان احکام کو درج فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

> حکومت کو اختیار ہے کہ (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) چاہے رہا کر دے چاہے ان سے فدیہ لے۔ چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھوں میں ہوں۔ اور چاہے تو انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں اپنے استعمال میں لائیں۔ (تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ صفحہ ۳۴۰)

وہ تفہیمات (جلد دوم) میں لکھتے ہیں۔

> ان عورتوں کے لئے اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو عورت حکومت کی طرف سے جس شخص کی ملکیت میں دے دی جائے اس کے ساتھ اس شخص کو جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دے دیا جائے۔ (صفحہ ۳۴۳)

اس جنسی تمتع کے لئے نکاح کی بھی ضرورت نہیں۔ (صفحہ [illegible])۔ اور تعداد کی بھی کوئی قید نہیں (صفحہ ۳۴۴)۔ انہیں فروخت بھی کیا جا سکتا ہے۔ (صفحہ ۳۴۲)[۱]

یہ ہے وہ اسلام جو ہمارے عہد ملوکیت میں وضع ہوا تھا اور جس کے احیاء کی اب کوشش کی جا رہی ہے۔ اور یہ ہے اس اسلام میں عورت کی حیثیت۔ لونڈیاں عورتیں ہی ہوتی ہیں۔

(۰)

---

[۱] ان امور کی تفصیل ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ (قتل مرتد اور غلام اور لونڈیاں) میں دیکھئے۔

معاشیات

ہمارا دور، عہد اقتصادیات (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے جس میں سرفہرست اہمیت معاشی نظام کو حاصل ہے۔ ہمارے دور پر ملوکیت کا اسلام سرمایہ داری کا نظام تھا اور فقہ کے احکام اسی نظام کی تشریحات پر مبنی ہیں۔ دنیا اب اس نظام کے ہاتھوں تنگ آچکی ہے لیکن مغرب کی سرمایہ دارانہ مملکتیں اسے کسی نہ کسی طرح برقرار رکھنے کے لئے کوشاں ہیں۔ اس کے لئے انہیں مسلمانوں کی مملکتوں کی تائید کی ضرورت ہے اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہمارے عہد ملوکیت کے اسلام کو حقیقی اسلام قرار دے کر اسے پھر زندہ کر دیا جائے۔ (اس اسلام میں اقتصادی نظام کس قسم کا تھا اور کس قسم کا ہوگا) اس کی بحث مودودی مرحوم نے اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" میں کی ہے۔ اس کے دو ایک اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں۔

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہیں۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں۔ پھر آخر تنہا زرعی جائداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے مقوق ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔ یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حد خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے بے کار کر دیا جائے (مسئلہ ملکیت زمین۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۰ء، ص ۵۲-۵۳)

آگے چل کر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

> آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر دینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو، جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں اس کے بعد جسطرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جسطرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہ راست خود کرو اور جسطرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کس ایسے کام پر حقوق ملکیت نہیں رکھ سکتے ہو جس کو تم اجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شراکت پر

کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوق ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون ساریاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں۔ مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں، وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔ (ایضاً ص ۷۲-۷۳)

یہ نظام سرمایہ داری کی ایسی شدید شکل ہے جسے اب سرمایہ دار مملکتیں بھی آہستہ آہستہ ترک کر رہی ہیں۔ اس کی ابتدا ابھی سے ہمارے ہاں ہو گئی ہے۔ بیحد و نہایت دولت جمع کرنا عین مطابق شریعت۔ مزارعت (بٹائی یا کرایہ پر زمین کاشت کرانا) جائز۔ مضاربت (یعنی سرمایہ پر نفع حاصل کرنا) حلال۔ بینکوں میں روپیہ جمع کرا کر منافع حاصل کرنا جائز۔ یعنی حکومت کی مقرر کردہ زکوٰۃ ادا کرتے رہو تو سب کچھ جائز۔ یعنی جس معاشی نظام کو قرآن، خدا اور رسولؐ کے خلاف بغاوت قرار دیتا ہے اسے عین مطابق اسلام قرار دے کر نافذ کیا جا رہا ہے۔

(۰)

سوال یہ ہے کہ اس قسم کا اسلام جو قرآن کے بھی خلاف ہے اور علم و عقل کے بھی منافی، وہ ہمارے دور ملوکیت میں قائم کیسے رہ سکتا تھا؟ اسے قائم رکھنے کے لئے ان حضرات کے پاس ایک بڑا مؤثر حربہ ہے۔ اور وہ ہے ارتداد کا فتویٰ۔ یعنی جو شخص اس اسلام کی کسی شق سے بھی انکار کرے، اس کے متعلق فتویٰ صادر کر دیا جائے کہ وہ مرتد ہو گیا ہے۔ اور مرتد کی سزا موت ہے۔

مرتد کی سزا موت

واضح رہے کہ مرتد سے مراد وہی شخص نہیں جو اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے۔ مرتد وہ بھی ہے جو ان حضرات کے عقائد سے اختلاف کرے۔ اس کی سزا بھی موت ہے۔ یہ کوئی نظری مسئلہ نہیں۔ ہماری تاریخ کے صفحات ان بیگناہوں کے خون سے رنگین ہیں جنہیں زعماء کے فتووں کی رو سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ اس کی شہادت بغداد کی گلیاں دیں گی جن کی نالیوں میں یہ خون پانی کی طرح بہتا رہا تھا۔ یہ مسئلہ مذہبی پیشواؤں کے علاوہ، خود حکومت کے لئے بھی بڑا مفید مطلب تھا۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) جس سیاسی حریف کو راستے سے ہٹانا مقصود ہوتا، اس کے خلاف ارتداد کا فتویٰ لگوا دیا جاتا۔ پھر اس کے قتل کے خلاف کوئی شخص لب کشائی نہ کر سکتا کیونکہ ایسا کرنے والے کو بھی مرتد قرار دے دیا جاتا۔

پاکستان میں جب مذہبی پیشوائیت نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں تو اس کے ساتھ ہی اس "مسئلہ" کی اہمیت بھی نمایاں کی گئی کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ چنانچہ مودودی مرحوم نے ۱۹۵۱ء میں اپنا وہ کتابچہ شائع کیا جس کا عنوان ہے "مرتد کی سزا، اسلامی قانون میں"۔ حضرات علماء کرام میں سے کسی نے اس کی مخالفت نہ کی، کیونکہ (بقول مودودی مرحوم)

یہ تمام فقہائے اسلام کا متفق علیہ فیصلہ ہے اور اس باب میں ماہرین علم شریعت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے (پمفلٹ مذکور ص ۷)

اس کی مخالفت بھی طلوع اسلام ہی کے مقدر میں لکھی تھی۔ چنانچہ اس نے متعدد مقالات میں اس پر تفصیلی بحث کی جسے بعد میں اس کتابچہ میں محفوظ کر دیا گیا جس کا عنوان ہے "قتل مرتد اور غلام اور لونڈیاں"۔

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ دور ملوکیت کے اسلام کے متعلق جو کچھ پہلے لکھا گیا ہے اس میں حوالے مودودی مرحوم کی کتابوں کے دیئے گئے ہیں لیکن یہ مرحوم کے اپنے خیالات نہیں۔ یہ سب اس فقہ اور روایات پر مبنی ہیں جن پر مذہبی پیشوائیت کا اتفاق ہے۔ اسی اسلام کو یہ حضرات یہاں رفتہ رفتہ رائج کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔

(۰)

میں آخر میں عرض کر دوں کہ (جیسا کہ میں نے اکثر کہا ہے) میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں۔ اس سے زیادہ میرا کوئی دعویٰ نہیں۔ میرا نہ کوئی فرقہ ہے، نہ پارٹی۔ نہ میرے پاس کوئی وسیع ذرائع یا وسائل ہیں۔ بلکہ ملک کے عام ذرائع ابلاغ جن کے دروازے ہر کس و ناکس پر کھلے ہیں، مجھ پر وہ بھی بند ہیں۔ مجھے اس کا نہ کوئی گلہ ہے نہ شکایت۔ قرآن کریم کی رو سے مجھ پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ جو کچھ میں قرآن سے سمجھوں اسے دوسروں تک بھی پہنچاؤں۔ میں اسی ملت کا ایک فرد ہوں؛ اس جہت سے میرے سینے میں ملت کا درد ہے۔ خطۂ پاکستان کے ساتھ میری (نزدیک کی نہیں تو دور کی) امیدیں وابستہ ہیں اس لئے اس کا استحکام میرا جزوِ زندگی ہے۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر میں جب کسی خطرہ کا احساس کرتا ہوں تو ملت کو اس سے آگاہ کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں۔ بنابریں میں ملک کے اربابِ دانش، اعیانِ سیاست حتیٰ کہ اربابِ اقتدار کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تھیاکریسی ابتداءً بڑی معصوم (INNOCENT) سی نظر آیا کرتی ہے لیکن جب یہ عوام پر اپنا تسلط جما لیتی ہے تو پھر اس سے پیچھا چھڑانا تو ایک طرف، اس کے سیلاب کی روک تھام بھی (اور تو اور) حکومت کے بھی بس کی بات نہیں ہوتی۔ تاریخ میں دیکھئے۔ کتنے تاج اس کے ہاتھوں اُڑتے اور کتنے تخت اس کے دھچکوں سے الٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے متعلق مودودی مرحوم نے دو ٹوک بات کہدی تھی۔ ان سے پوچھا گیا کہ اسلامی نظام قائم ہو جانے پر موجودہ "پیدائشی مسلمانوں" کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جائے گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ میرے نزدیک اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ:

قتلِ عام

جس علاقے میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً اور عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں، وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔ اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے گی کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے۔ پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے۔ اور اس عمل تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔ (مرتد کی سزا۔ ۱۹۵۱ء ایڈیشن صفحہ [illegible])

"اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں" یعنی جو ان کے ہمنوا ہوں! یہ ہوگا اسلامی نظام کی تکمیل کا دن!!

بعض خواب کس قدر حسین، لیکن ان کی تعبیر کیسی بھیانک ہوتی ہے۔ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے بویا کیا تھا اور اُگ کیا آیا؟ اقبالؒ زندہ ہوتا تو وہ یقیناً یہی کہتا کہ:

تخم دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو!
کانچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو

(بانگِ درا صفحہ ۲۴۳)

والسلام

(۰)